ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2910

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلومِ اسلامیہ — (شعبہ حدیث وعلومِ حدیث)

کورس: تاریخِ حدیث-II(2910)

سال: بی ایس علومِ اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026ء

امتحانی مشق نمبر1

کل نمبر: 100 — کامیابی کے نمبر: 50

Reference &For Study — GUIDE SOLVED ASSIGNMENT

نوٹ: یہ حل شدہ گائیڈ صرف مطالعہ اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ وہ نصابی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کر کے مفاہیم اچھی طرح سمجھیں اور امتحانی مشق اپنے الفاظ اور اپنے اندازِ تحریر میں لکھیں، کیونکہ ہو بہو نقل کی گئی مشق قواعد کے مطابق قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ یہ جوابات تاریخِ حدیث اور علومِ حدیث کے عمومی و مسلمہ علمی مباحث کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں۔ جہاں سنینِ وفات یا اعداد میں اہلِ علم کے ہاں اختلاف مشہور ہے وہاں اس کا اشارہ کر دیا گیا ہے۔ دینی احکام کے عملی اطلاق اور فتویٰ سے متعلق امور میں اہلِ علم اور مستند مفتیانِ کرام سے رجوع کیا جائے۔

طریقہ کار: ہر جواب تعارف، ذیلی عنوانات کے تحت مفصل بحث اور اختتام پر مشتمل ہے۔ جہاں سوال کا تقاضا ہو اوہاں جدول اور خاکہ بھی دیا گیا ہے تاکہ طالب علم نکات کو منظم انداز میں یاد کر سکے اور مشق بہتر ترتیب کے ساتھ لکھ سکے۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

تاریخِ حدیث - II(2910) بی ایس علومِ اسلامیہ کا کورس ہے جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے کلیہ عربی و علومِ اسلامیہ، شعبہ حدیث و علومِ حدیث کے تحت پڑھایا جاتا ہے۔

امتحانی مشق نمبر 1 میں پانچ سوالات ہیں، ہر سوال کے 20 نمبر ہیں، کل نمبر 100 اور کامیابی کے نمبر 50 ہیں: طبقاتِ رواۃِ حدیث، سعید بن مسیبؒ کی حالاتِ زندگی، تاریخ کی لغوی و اصطلاحی تعریف، علماءِ رجال پر جامع نوٹ، اور امام بیہقی و خطیب بغدادی کی تالیفی خدمات۔ ان سوالات کا مجموعی محور حدیث کے نقل کرنے والوں کی تاریخ اور اس تاریخ کو پرکھنے کے علوم ہیں۔ اس گائیڈ میں ہر سوال کا جواب تعارف، ذیلی عنوانات، جدول یا ڈاکے اور اختتام کے ساتھ دیا گیا ہے تاکہ طالب علم مفاہیم سمجھ کر اپنے الفاظ میں لکھ سکے۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال: طبقاتِ رواۃِ حدیث کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجئے۔(20)

تعارف

علمِ حدیث کی حفاظت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں صرف متن محفوظ نہیں رکھا گیا بلکہ متن کو نقل کرنے والوں، یعنی راویوں، کی پوری تاریخ بھی محفوظ رکھی گئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آخری مرتب تک ہر سند کئی انسانی واسطوں پر مشتمل ہوتی ہے، اور ان واسطوں کو سمجھنے کے لیے محدثین نے راویوں کو ان کے زمانے، صحبت و تلمذ اور علمی مرتبے کے اعتبار سے طبقات میں تقسیم کیا۔ طبقاتِ رواۃ کا علم اسی تقسیم کا نام ہے۔ یہ علم طالب علم کو بتاتا ہے کہ کون سا راوی صحابی ہے، کون تابعی ہے، کون تبع تابعی ہے اور کون بعد کے دور کا محدث ہے، تاکہ سند کی اتصال و انقطاع کی جانچ، کسی راوی کے سماع کے امکان کا فیصلہ اور روایت کے درست مقام کی تعیین ممکن ہو سکے۔ اس جواب میں پہلے طبقہ اور راوی کا مفہوم بیان ہو گا، پھر طبقات بنانے کی بنیادیں، بڑے بڑے مصنفین کی طبقاتی تقسیمیں، حافظ ابنِ حجر کی مشہور بارہ طبقات والی تقسیم بطور خاص، اور آخر میں اس علم کے فوائد و ثمرات کا جائزہ لیا جائے گا۔

طبقہ اور راوی کا مفہوم

طبقہ کے لغوی معنی ہیں ایک جیسی جماعت، درجہ اور گروہ۔ اہلِ لغت کے ہاں طبقہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی ایک وصف میں مشترک ہوں اور ایک ہی زمانے یا ایک ہی مرتبے میں جمع ہوں۔ محدثین کی اصطلاح میں طبقہ سے مراد راویوں کی وہ جماعت ہے جو سن یعنی عمر، اساتذہ سے ملاقات اور روایت کے زمانے میں تقریباً ہم عصر اور ہم مرتبہ ہو، جیسے صحابہ کا طبقہ، کبار تابعین کا طبقہ اور صغار تابعین کا طبقہ۔ راوی اس شخص کو کہتے ہیں جو حدیث کو سند کے ساتھ نقل کرے۔ جب راویوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور ہر دور میں سینکڑوں راوی ایک ساتھ روایت کرنے لگے تو ان کے درمیان امتیاز کے لیے مبادیٔ تقسیم ناگزیر ہو گئی۔ یہی تقسیم آگے چل کر کتبِ طبقات کی صورت میں ایک مستقل فن بن گئی، جس میں ہر راوی کا نام، نسب، اساتذہ، شاگرد، سنِ وفات اور علمی مرتبہ اپنے طبقے کے اندر درج کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ طبقے کی تعیین کا اصل مدار زمانہ اور ملاقات ہے، محض وفات کا سال نہیں، کیونکہ ایک ہی سال میں وفات پانے والے دو راوی بھی مختلف طبقات سے تعلق رکھ سکتے ہیں اگر ان کے اساتذہ اور دورِ روایت میں واضح فرق ہو۔ اسی لیے محدثین طبقے کی بحث میں عموماً ہم عصری، استادوں سے اخذ اور روایت کے دور کو ملا کر فیصلہ کرتے ہیں۔

طبقات بنانے کی بنیادیں اور اصول

محدثین نے طبقات کی تقسیم میں چند بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ پہلی بنیاد صحبت ہے: جس نے ایمان کی حالت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور ایمان ہی پر اس کا انتقال ہوا وہ صحابی ہے، اور تمام صحابہ مجموعی اعتبار سے پہلا اور افضل طبقہ ہیں، اگرچہ ان کے اندر بھی اسلام قبول کرنے کی سبقت، غزوات میں شرکت اور روایت کی کثرت کے اعتبار سے درجے موجود ہیں۔ دوسری بنیاد اساتذہ سے ملاقات اور اخذ ہے: جس تابعی نے بڑے صحابہ سے زیادہ روایت کی وہ کبار تابعین میں شمار ہوا اور جس نے صرف چھوٹے صحابہ یا چند صحابہ سے روایت کی وہ صغار تابعین میں رکھا گیا۔ تیسری بنیاد زمانہ و سن ہے: ایک ہی دور میں پیدا ہونے اور روایت کرنے والے عموماً ایک طبقے میں رکھے جاتے ہیں۔ چوتھی بنیاد علاقہ و شہر بھی رہی ہے، کیونکہ بعض مصنفین نے مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، شام اور مصر کے راویوں کو الگ الگ طبقات میں بیان کیا ہے، جس سے ہر شہر کی علمی تاریخ بھی واضح ہوتی ہے اور راوی کے ہم عصر اساتذہ کی شناخت بھی آسان رہتی ہے۔ پانچویں بنیاد روایت کا دورانیہ اور شاگردوں کا حلقہ ہے: جس راوی سے اگلے

طبقے کے بڑے ائمہ نے روایت کی ہو اسے اسی نسبت سے مقام دیا جاتا ہے۔ ان اصولوں کی وجہ سے مختلف مصنفین کی تقسیم میں طبقات کی تعداد یکساں نہیں رہی؛ کسی نے مجموعی طور پر تین بڑے طبقے بنائے، کسی نے پانچ، کسی نے آٹھ اور کسی نے بارہ تک طبقات شمار کیے۔ یہ اختلاف اصول کا نہیں، تفصیل و اجمال کا ہے، اور ہر مصنف نے اپنے مقصد کے مطابق تقسیم اختیار کی ہے۔

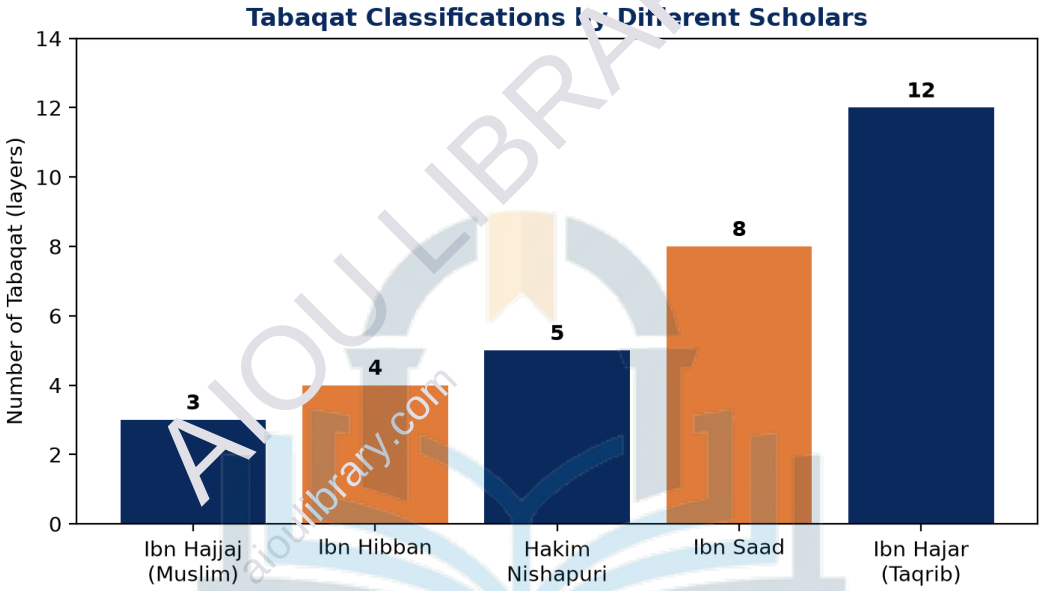

خاکہ 1: مختلف محدثین کی طبقاتی تقسیم میں طبقات کی تعداد کا تقابلی جائزہ (تدریسی خلاصہ)

مشہور مصنفین اور ان کی طبقاتی تقسیمیں

طبقات پر سب سے قدیم اور مفصل کتاب امام محمد بن سعد (متوفی 230ھ) کی الطبقات الکبریٰ ہے، جس میں انہوں نے سیرتِ نبوی کے بعد صحابہ، تابعین اور بعد کے راویوں کو مدینہ اور دیگر شہروں کے اعتبار سے کئی طبقات میں بیان کیا ہے، اور یہ کتاب آج بھی سیرت و رجال کا بنیادی ماخذ ہے۔ خلیفہ بن خیاط (متوفی 240ھ) نے اپنی کتاب الطبقات میں راویوں کو گیارہ بارہ طبقات تک تقسیم کیا اور ہر شہر کے راویوں کو الگ رکھا۔ امام مسلم بن حجاج (متوفی 261ھ) نے اپنی کتاب الطبقات میں اجمالی تقسیم اختیار کی اور راویوں کو تین بڑے طبقات میں رکھا: صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے راوی۔ حافظ ابنِ حبان (متوفی 354ھ) نے مشاہیر علماء الامصار اور الثقات میں چار طبقات کی

ترتیب رکھی: صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور تبعِ تبع تابعین۔ حاکم نیشاپوری (متوفی 405ھ) نے معرفۃ علوم الحدیث میں راویوں کے پانچ طبقات بیان کیے۔ اس کے علاوہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حفاظِ حدیث کو اکیس طبقات میں اور سیر اعلام النبلاء میں زمانی ترتیب سے بیان کیا، جبکہ میزان الاعتدال میں ضعیف راویوں پر کلام کیا۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے تقریب التہذیب میں راویوں کی سب سے مشہور اور آج سب سے زیادہ استعمال ہونے والی تقسیم پیش کی، جن کا ذکر اگلے عنوان میں آ رہا ہے۔ ان تمام کاوشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقات کا فن محض فہرست سازی نہیں بلکہ ہر دور کے اہلِ علم نے اسے سند کی جانچ کا بنیادی ذریعہ سمجھ کر اسے باقاعدہ ترقی دی ہے۔

حافظ ابنِ حجر کی بارہ طبقات والی تقسیم

تقریب التہذیب کتبِ ستہ کے راویوں کے مختصر تعارف کی مشہور کتاب ہے، جس کے مقدمے میں حافظ ابنِ حجر نے راویوں کو بارہ طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا طبقہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ دوسرا طبقہ کبار تابعین کا ہے، جیسے حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ۔ تیسرا طبقہ متوسط درجے کے تابعین کا ہے، جیسے امام حسن بصری اور امام ابنِ سیرین رحمہما اللہ۔ چوتھا طبقہ صغار تابعین کا ہے جن کی زیادہ تر روایت کبار تابعین سے ہے، جیسے امام زہری اور قتادہ رحمہما اللہ۔ پانچواں طبقہ ان تابعین کا چھوٹا گروہ ہے جنہوں نے ایک یا دو تابعین سے روایت کی اور ان سے معروف ائمہ نے زیادہ روایت نہیں کی۔ چھٹا طبقہ ان راویوں کا ہے جو پانچویں طبقے کے ہم عصر ہیں مگر کسی صحابی سے ان کی ملاقات ثابت نہیں۔ ساتواں طبقہ کبار تبع تابعین کا ہے، جیسے امام مالک اور امام سفیان ثوری رحمہما اللہ۔ آٹھواں طبقہ متوسط تبع تابعین کا ہے، جیسے امام ابنِ عیینہ رحمہ اللہ۔ نواں طبقہ صغار تبع تابعین کا ہے، جیسے امام شافعی، امام عبدالرزاق اور ابوداؤد طیالسی رحمہم اللہ۔ دسواں طبقہ ان کبار راویوں کا ہے جنہوں نے تبع تابعین سے اخذ کیا مگر خود تابعین سے ملاقات نہیں کی، جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ۔ گیارہواں طبقہ متوسط درجے کے ان راویوں کا ہے، جیسے امام بخاری رحمہ اللہ، اور بارہواں طبقہ صغار درجے کے راویوں کا ہے، جیسے امام ترمذی رحمہ اللہ۔ اس تقسیم کی خوبصورتی یہ ہے کہ تقریب کا کوئی بھی مختصر ترجمہ پڑھتے ہوئے طالب علم فوراً جان لیتا ہے کہ راوی کس دور کا ہے، اس کے ممکنہ اساتذہ کون ہو سکتے ہیں اور اس کی روایت کو کس طبقے کی سندوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

جدول 1: طبقاتِ رواۃ کی اجمالی ترتیب اور مثالیں

طبقہ	عمومی تعارف	نمایاں مثال
صحابہ	جنہوں نے ایمان کی حالت میں نبی اکرم ﷺ کو دیکھا	حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
کبار تابعین	بڑے صحابہ سے کثرت سے روایت کرنے والے	سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر رحمہا اللہ
اوساط و صغار تابعین	متوسط اور چھوٹے صحابہ سے روایت کرنے والے	حسن بصری، امام زہری رحمہا اللہ
تبع تابعین	تابعین سے اخذ کرنے والی نسل	امام مالک، سفیان ثوری رحمہا اللہ
تبعِ تبع تابعین و بعد کے ائمہ	کتبِ حدیث کے مصنفین اور ان کے معاصرین	امام بخاری، امام مسلم، امام احمد رحمہم اللہ

طبقات کے علم کے فوائد و ثمرات

طبقات کے علم کے فوائد بہت وسیع ہیں۔ سب سے پہلا فائدہ سند کے اتصال کی جانچ ہے: اگر کوئی راوی اپنے سے دو طبقے اوپر کے شیخ سے براہِ راست روایت کا دعویٰ کرے تو طبقات کا علم فوراً بتا دیتا ہے کہ یہ سماع ممکن ہے یا اس میں انقطاع، ارسالِ خفی یا تدلیس کا شبہ ہے۔ دوسرا فائدہ ہم نام راویوں میں تمیز ہے؛ کتبِ رجال میں ایک ہی نام کے کئی راوی ملتے ہیں اور طبقے کا فرق ہی ان کی شناخت کا سب سے آسان ذریعہ بنتا ہے۔ تیسرا فائدہ جرح و تعدیل میں ہے، کیونکہ کسی راوی پر کلام کرنے والے ناقد کا دور معلوم ہو تو اس کلام کی نوعیت سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اور متقدمین و متاخرین کے حکم میں فرق بھی واضح رہتا ہے۔ چوتھا فائدہ تاریخِ حدیث کی ترتیب ہے: کس دور میں روایت کا مرکز مدینہ رہا، کب کوفہ و بصرہ نمایاں ہوئے اور کب خراسان سے بڑے ائمہ اٹھے، یہ سب طبقات ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ پانچواں فائدہ یہ ہے کہ طالب علم کسی بھی نئی سند کو دیکھ کر خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس میں کتنے واسطے صحابی تک پہنچتے ہیں اور ہر واسطے کا دور کیا ہے، یوں حفظِ اسانید محض رٹا نہیں رہتا بلکہ تاریخی فہم کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصولِ حدیث کی کتابوں میں طبقات کی بحث کو رواۃ کی معرفت کا لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے اور ہر دور میں اس پر مستقل کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ طبقاتِ رواۃِ حدیث راویوں کی وہ زمانی و علمی درجہ بندی ہے جس کی بنیاد صحبت، ملاقات، زمانہ اور روایت کے دور پر ہے۔ ابنِ سعد سے لے کر ابنِ حجر تک محدثین نے اس فن کو ترقی دی اور تقریب التہذیب کی بارہ مقامات والی تقسیم آج عملی مطالعے میں سب سے زیادہ کارآمد ہے۔ اس علم کے بغیر نہ سند کی جانچ مکمل ہوتی ہے، نہ ہم نام راویوں میں تمیز ممکن رہتی ہے اور نہ تاریخِ حدیث کی درست ترتیب سمجھ میں آتی ہے۔ لہٰذا تاریخِ حدیث کے طالب علم کے لیے طبقات کی معرفت محض اضافی معلومات نہیں بلکہ پورے علمِ حدیث کو سمجھنے کی کنجی ہے۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

سوال: سعید ابن المسیبؒ کی حالاتِ زندگی پر تفصیلی مضمون تحریر کریں۔ (20)

تعارف

تابعین کی جماعت میں جن شخصیات کو علم و فقہ، زہد و تقویٰ اور روایتِ حدیث تینوں میدانوں میں امامت کا درجہ حاصل ہوا، ان میں حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کا نام سرِ فہرست ہے۔ اہلِ مدینہ انہیں سید التابعین کہتے تھے، امام زہری اور دیگر ائمہ نے انہیں اپنے دور کا سب سے بڑا عالم قرار دیا، اور فقہائے مدینہ کے مشہور سات فقہاء میں ان کا شمار سب سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی مرویات صحیحین سمیت کتبِ حدیث میں بڑی کثرت سے موجود ہیں، اور ان کی مرسل روایات کی بحث اصولِ حدیث کی کتابوں میں مستقل عنوان رکھتی ہے۔ اس مضمون میں ان کے نام و نسب اور خاندان، ولادت و پرورش، اساتذہ و تلامذہ، علمی مقام اور فقہی خدمات، زہد و استقامت کے مشہور واقعات، وفات اور ان کے علمی آثار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا، تاکہ طالب علم کے سامنے ایک کامل تابعی عالم کی زندگی کا متوازن نقشہ آ جائے۔

نام، نسب، خاندان اور ولادت

آپ کا پورا نام سعید بن المسیب بن حزن بن ابی وہب قرشی مخزومی ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب قریش کے مشہور خاندان بنو مخزوم سے ملتا ہے، جو مکہ کے بااثر قبائل میں سے تھا۔ آپ کے والد حضرت مسیب بن حزن رضی اللہ عنہ صحابی تھے، ابتدا میں اسلام سے دور رہے مگر بعد میں مسلمان ہوئے اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے صحابہ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ آپ کے دادا حزن رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے اور ان کے نام کی تبدیلی کا مشہور واقعہ کتبِ حدیث میں ملتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام سہل رکھنا پسند فرمایا تھا۔ سعید بن مسیب کی ولادت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوئی؛ مشہور قول کے مطابق آپ 13ھ یا 15ھ کے لگ بھگ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ یوں انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تو نہ ملی، مگر انہوں نے صحابہ کی ایک بڑی جماعت کو دیکھا، ان کی مجالس میں بیٹھے اور ان سے براہِ راست علم حاصل کیا، اسی لیے وہ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کی شادی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے ہوئی جس کی وجہ سے آپ کو حضرت ابوہریرہ کے علم تک خاص رسائی حاصل رہی اور آپ ان کے علم کے بڑے ناقلین میں شمار ہوئے۔ مدینہ منورہ ہی آپ کی پیدائش، تعلیم، تدریس اور وفات کا شہر رہا، اور آپ کی پوری زندگی اسی شہر کے علمی ماحول سے وابستہ گزری۔

حصولِ علم، اساتذہ اور تلامذہ

سعید بن مسیب نے علم کی طلب میں غیر معمولی محنت کی۔ اہلِ سیر لکھتے ہیں کہ وہ ایک ایک مسئلے اور ایک ایک حدیث کے لیے کئی کئی دن سفر اور تلاش میں گزار دیتے تھے اور صحابہ کرام کی مجالس میں باقاعدگی سے حاضر ہوتے تھے۔ ان کے اساتذہ میں بڑے بڑے صحابہ شامل ہیں: حضرت عثمان بن عفان، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم اجمعین سے انہوں نے روایت کی اور فیض حاصل کیا۔ خلفائے راشدین میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے ان کی روایت مرسل مانی جاتی ہے کیونکہ ان کا دور انہوں نے نہیں پایا تھا۔ حدیث کے ساتھ ساتھ فقہ میں ان کا ذوق خاص تھا؛ وہ صحابہ کے فیصلوں اور قضایا کو جمع کرتے اور ان پر غور کرتے تھے، اسی لیے ان کی فقہ کو مدینہ کے عمل اور صحابہ کے

آثار کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے، جن میں امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری، قتادہ بن دعامہ، یحییٰ بن سعید انصاری، بکیر بن عبد اللہ اور ان کے صاحبزادے محمد بن سعید نمایاں ہیں، بلکہ بڑے بڑے ائمہ نے یہ کہا ہے کہ انہوں نے سعید بن مسیب سے بڑا عالم اپنے زمانے میں نہیں دیکھا۔ آپ کی مجلس مسجدِ نبوی میں حلقۂ علم کی حیثیت رکھتی تھی جہاں دور دراز سے طلبہ آتے تھے۔

علمی مقام، فقہی خدمات اور مرسلات کا مسئلہ

اہلِ علم نے سعید بن مسیب کے علمی مقام کو بڑے واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ انہیں روایتِ حدیث میں سب سے زیادہ جاننے والا، قضایا و احکام میں سب سے بڑا فقیہ اور مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں سب سے نمایاں قرار دیا گیا ہے۔ یہ سات فقہاء، یعنی عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابو بکر بن عبد الرحمن، عبید اللہ بن عبد اللہ، خارجہ بن زید، سلیمان بن یسار اور سعید بن مسیب رحمہم اللہ، وہ جماعت تھی جس پر اس دور میں مدینہ کی فقہ کا مدار تھا اور لوگ دور دور سے ان سے مسائل پوچھنے آتے تھے۔ اصولِ حدیث میں سعید بن مسیب کی مراسیل کی بحث بہت مشہور ہے۔ مرسل وہ روایت ہے جس میں تابعی صحابی کا ذکر کیے بغیر براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے۔ عام مرسل روایات پر اہلِ علم تفصیل سے کلام کرتے ہیں، مگر سعید بن مسیب کی مرسلات کو بہت سے ائمہ نے سب سے مضبوط مراسیل میں شمار کیا ہے، کیونکہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ عموماً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے بڑے صحابہ ہی سے روایت کرتے تھے، اس لیے امام شافعی اور دیگر ائمہ نے ان کی مرسل کو بعض شرائط کے ساتھ قبولیت میں دوسروں پر مقدم رکھا، البتہ اس بحث میں اہلِ علم کے درمیان معروف علمی اختلاف موجود ہے جس کا اطلاق و ترجیح اہلِ فن کا کام ہے۔ فقہ میں ان کے اقوال بعد کے ائمہ، خصوصاً امام مالک کے ہاں موطا اور مدینہ کے عمل کی بنیادوں میں نظر آتے ہیں، اور ان کے فتاویٰ و قضایا کتبِ فقہ و آثار میں محفوظ ہیں۔

جدول 1: سعید بن مسیبؒ کی زندگی کے اہم نکات

تفصیل	پہلو
سعید بن المسیب بن حزن قرشی مخزومی؛ والد حضرت مسیب بن حزن رضی اللہ عنہ	نام و نسب

صحابی	
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مدینہ منورہ؛ مشہور اقوال 13ھ تا 15ھ	ولادت
کبار تابعین؛ سید التابعین اور مدینہ کے سات فقہاء میں نمایاں	درجہ
حضرت عثمان، علی، ابوہریرہ، عائشہ، ابنِ عباس، ابنِ عمر رضی اللہ عنہم	مشہور اساتذہ
امام زہری، قتادہ، یحییٰ بن سعید انصاری رحمہم اللہ	مشہور شاگرد
94ھ، مدینہ منورہ — یہ سال کتب میں عام فقہاء کی وفات کا سال مشہور ہے	وفات

زہد، عبادت اور حق پر استقامت

سعید بن مسیب کی سیرت کا روشن پہلو ان کا زہد، عبادت اور حق بات پر استقامت ہے۔ اہلِ سیر لکھتے ہیں کہ انہوں نے طویل عرصے تک باجماعت نماز کی پابندی اس درجے کی کہ عشاء و فجر کی نمازیں مسجدِ نبوی میں مسلسل ادا کرتے رہے۔ وہ دنیاوی مال و منصب سے بے نیاز تھے؛ خود محنت کر کے اور تجارت سے حلال رزق کماتے اور حکمرانوں کے عطیات قبول کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کی استقامت کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ جب عبدالملک بن مروان کے دور میں مدینہ کے گورنر ہشام بن اسماعیل نے لوگوں سے خلیفہ کے دونوں بیٹوں کے لیے بیک وقت بیعت لینا چاہی تو سعید بن مسیب نے اس طریقے کو درست نہ سمجھ کر بیعت سے انکار کر دیا، جس پر انہیں کوڑوں کی سزا دی گئی، مگر انہوں نے اپنا موقف واپس نہ لیا۔ اسی طرح ان کی صاحبزادی کے لیے ایک اموی شہزادے کے پیغام کو انہوں نے دنیاوی جاہ و مال کے مقابلے میں ایک غریب طالب علم سے نکاح پر ترجیح دے کر رد کیا، اور اپنی بیٹی کی شادی اسی طالب علم سے کر دی جو بعد میں بڑا عالم بنا؛ یہ واقعہ اہلِ سیر نے علم کی قدر اور دنیاوی مرتبے پر دین کو ترجیح دینے کی مثال کے

طور پر محفوظ رکھا ہے۔ ان سیرتی پہلوؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ سعید بن مسیب کا علم محض روایت و معلومات کا نام نہیں تھا بلکہ عمل، خوفِ خدا اور استقامت کے ساتھ جڑا ہوا تھا، یہی وہ وصف ہے جس کی وجہ سے امت نے ان کی روایت اور فقہ دونوں کو پورے اعتماد کے ساتھ قبول کیا۔

وفات اور علمی میراث

حضرت سعید بن مسیب کا انتقال 94ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا۔ کتبِ تاریخ میں یہ سال سنۃ الفقہاء بھی کہلاتا ہے، کیونکہ اسی سال مدینہ کے کئی بڑے فقہاء و تابعین کا انتقال ہوا تھا اور عروہ بن زبیر سمیت دیگر فقہاء بھی اسی دور کے آس پاس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے جنازے اور وفات کی خبر مدینہ کے لیے بڑے غم کا سبب بنی، کیونکہ ان کے ساتھ علم کا ایک پورا دور بند ہو رہا تھا۔ ان کی علمی میراث تحریری کتابوں کی صورت میں تو نہیں ملی، کیونکہ اس دور میں تصنیف کا رواج ابھی محدود تھا، البتہ ان کی ہزاروں مرویات، فتاویٰ اور قضایا ان کے شاگردوں کے ذریعے صحیحین، سنن اور موطا و مصنفات میں محفوظ ہو گئے۔ حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں اور ابنِ سعد نے طبقات میں ان کے تفصیلی حالات محفوظ کیے ہیں۔ آج بھی جب کوئی طالب علم مدینہ کی فقہ، تابعین کے دور کی روایت یا مرسلات کی بحث پڑھتا ہے تو سعید بن مسیب کا نام بنیادی حوالے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ان کی زندگی اس بات کی عملی مثال ہے کہ صحبتِ صحابہ، محنتِ طلب، عبادت اور استقامت مل کر ایک تابعی کو سید التابعین کے مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کبار تابعین کے امام، مدینہ کے سات فقہاء کے سرخیل اور روایت و فقہ دونوں کے مسلمہ استاد تھے۔ صحابی والدین کے علمی گھرانے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے اساتذہ کی صحبت، امام زہری جیسے شاگردوں کی تربیت، زہد و عبادت اور حق پر سزا برداشت کرنے کی استقامت؛ یہ سب مل کر ان کی شخصیت کو تابعین کی تاریخ کا روشن باب بنا دیتے ہیں۔ 94ھ میں ان کی وفات سے مدینہ کا ایک علمی عہد ختم ہوا، مگر ان کی مرویات و اقوال کتبِ حدیث و فقہ کے ذریعے آج تک امت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

سوال نمبر3 (20نمبر)

سوال: تاریخ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف تفصیل کے ساتھ بیان کیجئے۔(20)

تعارف

تاریخ انسانی زندگی کا آئینہ ہے۔ ہر قوم اپنے ماضی کو اس لیے محفوظ رکھتی ہے کہ اس سے حال کو سمجھنے اور مستقبل کی راہ متعین کرنے میں مدد ملے۔ مسلمانوں کے ہاں تاریخ محض قصے کہانیوں کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ اس نے بہت جلد ایک باقاعدہ علم کی صورت اختیار کر لی اور اس کی سب سے بڑی وجہ خود علمِ حدیث تھا، کیونکہ روایت کی جانچ کے لیے راویوں کی پیدائش و وفات، ان کے اسفار اور ان کے ادوار جاننا ضروری تھا، یوں تاریخ اور حدیث دونوں علوم ایک دوسرے کے معاون بن گئے۔ نصاب کے اس کورس کا نام ہی تاریخِ حدیث ہے، اس لیے طالب علم کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تاریخ کسے کہتے ہیں، اس کی لغوی بنیاد کیا ہے اور اہلِ علم نے مختلف ادوار میں اس کی کیا تعریفیں کی ہیں۔ اس جواب میں تاریخ کا لغوی مفہوم، لفظ کی اصل پر اہلِ لغت کی بحث، پھر ابنِ خلدون، کافیجی اور سخاوی جیسے بڑے مؤرخین و محدثین کی اصطلاحی تعریفیں، ان تعریفوں کا تقابلی جائزہ، اور آخر میں تاریخ کی اہمیت و اقسام کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔

تاریخ کا لغوی مفہوم

لفظِ تاریخ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اہلِ لغت کے مشہور قول کے مطابق یہ اَرخ یا رُخ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں وقت متعین کرنا، کسی واقعے کا زمانہ مقرر کرنا اور کسی چیز کی تاریخ لکھنا۔ اسی سے تاَریخ بمعنی وقت کی تعیین اور مؤرخ بمعنی تاریخ لکھنے والا بنا۔ بعض اہلِ لغت نے اس لفظ کی اصل پر بحث کرتے ہوئے اسے اس مفہوم سے جوڑا ہے کہ جس طرح تاریخ بتانے سے واقعہ اسی طرح واضح ہو جاتا ہے جیسے چاند نظر آنے سے مہینے کا آغاز واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ قدیم زمانے میں مہینوں اور واقعات کا حساب چاند ہی سے رکھا جاتا تھا۔ اردو میں بھی تاریخ کا استعمال تین معنوں میں عام ہے: کسی خاص دن اور تاریخ کی تعیین، جیسے آج کیا تاریخ ہے؛ گزرے ہوئے واقعات کا علم؛ اور وہ کتاب جس میں کسی قوم، ملک یا شخصیت کے حالات درج ہوں۔ علمی بحث میں ہمارے پیشِ نظر دوسرا اور تیسرا مفہوم ہے، یعنی تاریخ سے مراد ماضی کے واقعات کا علم اور اس علم کو بیان کرنے والا

فن ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ مسلمانوں میں سنِ ہجری کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں رکھی گئی، جب واقعات کے لیے ایک متعین تقویم کی ضرورت محسوس ہوئی اور ہجرتِ نبوی کو اس کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا؛ اس فیصلے نے تاریخی واقعات کی ترتیب و تعیین کو ایک مضبوط نظام دے دیا۔

اصطلاحی تعریف: علامہ ابنِ خلدون کی تعریف

مؤرخین میں سب سے مشہور اور جامع تعریف علامہ ابنِ خلدون (متوفی 808ھ) نے اپنے شہرہ آفاق مقدمے میں پیش کی۔ ان کی نگاہ میں تاریخ بظاہر تو گزشتہ اقوام، انبیاء اور بادشاہوں کے حالات و اخبار کا نام ہے، مگر اس کی حقیقت اس سے کہیں گہری ہے۔ تاریخ دراصل انسانی اجتماع، عمران اور تہذیب میں پیش آنے والی تبدیلیوں پر غور و فکر اور ان کے اسباب کی تحقیق کا نام ہے۔ ابنِ خلدون نے واضح کیا کہ تاریخی خبر کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے عمران کے اصولوں اور انسانی فطرت کے تقاضوں پر پرکھنا چاہیے، کیونکہ بہت سی خبریں اس لیے غلط ہوتی ہیں کہ وہ خلافِ عادت و خلافِ عمران ہوتی ہیں۔ اس تعریف کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تاریخ کو محض واقعات کی فہرست نہیں رکھا گیا بلکہ اسباب و علل کی تلاش اور تنقیدی شعور کو اس کا حصہ بنایا گیا ہے، اسی لیے ابنِ خلدون کو عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تعریف آج کی جدید تاریخ نویسی کے بہت قریب ہے، کیونکہ آج کا مؤرخ بھی واقعہ بیان کرنے کے ساتھ اس کے سماجی، معاشی اور سیاسی اسباب ضرور بیان کرتا ہے۔ البتہ ابنِ خلدون کی تعریف کا محور زیادہ تر تہذیب و سلطنت ہے، جبکہ محدثین کے ہاں تاریخ کا دائرہ افراد و راویوں کی سوانح تک بھی پھیلا ہوا ہے، جس کی تکمیل اگلی تعریفوں سے ہوتی ہے۔

محدثین کی تعریفیں: کافیجی اور سخاوی

محدثین و سیرت نگاروں کے ہاں تاریخ کی تعریف کا مرکز واقعے کے زمانے کی درست تعیین اور اس زمانے میں پیش آنے والے احوال کا بیان ہے۔ علامہ کافیجی (متوفی 879ھ) نے اپنی رسالہ فی علم التاریخ میں تاریخ کی تعریف اس مفہوم میں کی ہے کہ یہ وہ علم ہے جس میں گزشتہ زمانوں کے احوال، یعنی انبیاء علیہم السلام، امم، بادشاہوں، علماء اور بڑے واقعات کی خبریں اور ان کے زمانوں کی تعیین بیان کی جاتی ہے تاکہ بعد والوں کو پہلوں کے حالات معلوم ہو سکیں۔ حافظ سخاوی (متوفی 902ھ) نے اپنی مشہور کتاب الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ میں تاریخ کی جامع بحث کی ہے۔ ان کے ہاں تاریخ دراصل وقت کی تعیین کا فن ہے جس کے ذریعے کسی واقعے کے پیش آنے کا زمانہ ضبط کیا جاتا ہے،

اور اس کا فائدہ راویوں کی پیدائش و وفات، ان کے سماع و ملاقات اور واقعات کی صحیح ترتیب جاننے میں ظاہر ہوتا ہے۔ سخاوی نے تاریخ کے فوائد گنواتے ہوئے دکھایا ہے کہ اسی علم سے جھوٹی نسبتوں کا پردہ چاک ہوتا ہے، مدعیانِ سماع کی جانچ ہوتی ہے اور سیرت و مغازی کی درست ترتیب قائم رہتی ہے۔ ان تعریفوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک تاریخ کا سب سے قریبی رشتہ علمِ حدیث اور علمِ رجال سے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آج کے کورس میں تاریخِ حدیث پڑھنے والا طالب علم پہلے یہی بنیادی مفاہیم پڑھتا ہے۔ دونوں تعریفوں کو ملا کر کہا جا سکتا ہے کہ اصطلاح میں تاریخ وہ علم ہے جس میں ماضی کے انسانوں، اقوام اور واقعات کے احوال ان کے درست زمانوں کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ان خبروں کو اصولِ تحقیق پر پرکھا جائے۔

جدول 1: تاریخ کی اہم تعریفوں کا تقابلی خلاصہ

عالم	تعریف کا نور	نمایاں خوبی
عام لغوی مفہوم	وقت اور زمانے کی تعیین	ہر تعریف کی بنیاد
ابنِ خلدون (808ھ)	انسانی عمران و تہذیب کی تبدیلیوں اور ان کے اسباب کی تحقیق	اسباب و تنقید کی شمولیت؛ فلسفۂ تاریخ کی بنیاد
کافیجی (879ھ)	گزشتہ زمانوں کے احوال و اخبار اور ان کے زمانوں کا بیان	موضوع کی وسعت: انبیاء، امم، علماء و ملوک
سخاوی (902ھ)	واقعات کے زمانے کی ضبط و تعیین بطور فن	رجال و روایت کی جانچ سے عملی ربط

تاریخ کی اقسام، مآخذ اور اہمیت

موضوع کے اعتبار سے تاریخ کی کئی قسمیں بنتی ہیں۔ سیرت و مغازی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و غزوات بیان ہوتے ہیں؛ طبقات و تراجم میں علماء، محدثین اور دیگر شخصیات کی سوانح آتی ہیں؛ تواریخِ عالم و امم میں اقوام و سلطنتوں کی تاریخ بیان ہوتی ہے؛ اور مقامی تاریخوں میں کسی ایک شہر یا علاقے کے احوال درج ہوتے ہیں، جیسے خطیب بغدادی کی تاریخِ بغداد۔ تاریخ کے مآخذ میں تحریری دستاویزات، سیر و رجال، روایات و آثار اور دستیاب شواہد شامل ہیں، اور مؤرخ کا کمال یہ ہے کہ وہ ان مآخذ کو سند و درایت کے اصولوں پر پرکھ کر استعمال کرے۔ تاریخ کی اہمیت ہر دور میں تسلیم شدہ ہے: یہ اقوام کے لیے عبرت و نصیحت کا سامان دیتی ہے، بھولے ہوئے اسلاف کے کارنامے زندہ رکھتی ہے، جھوٹی نسبت اور بے بنیاد دعوے کو بے نقاب کرتی ہے، اور علومِ دینیہ خصوصاً حدیث، فقہ کی تاریخ اور فرق و ادوار کی ترتیب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اہلِ علم نے یہ بھی لکھا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کو وسعتِ نظر دیتا ہے، کیونکہ وہ ایک ہی زندگی میں صدیوں کے تجربے سے گزرتا ہے۔ البتہ علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخی خبروں کو ان کے درجے کے مطابق پیش کیا جائے، انفرادی واقعات سے کلی دینی احکام اخذ کرنے اور فتویٰ دینے کا کام اہلِ علم کے سپرد رہے، اور طالب علم کا کام خبر کو اصول کے مطابق سمجھنا اور بیان کرنا ہو۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کا لغوی معنی وقت کی تعیین ہے، اور اصطلاح میں اس سے مراد ماضی کے احوال و واقعات کا وہ علم ہے جس میں واقعات درست زمانوں کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ان پر تنقیدی غور بھی کیا جائے۔ ابنِ خلدون نے اس میں اسبابِ عمران کی تحقیق کا اضافہ کیا، کافیجی نے اس کے موضوع کی وسعت واضح کی اور سخاوی نے اسے روایت و رجال کی جانچ سے جوڑ کر اس کا عملی فائدہ دکھایا۔ مسلمانوں کے ہاں تاریخ کا یہ معیار خود علمِ حدیث کی دین ہے، اور تاریخِ حدیث کا پورا کورس اسی مضبوط بنیاد پر قائم ہے کہ واقعہ بھی محفوظ ہو اور اس کا زمانہ بھی۔

سوال نمبر4 (20نمبر)

سوال: علماءِ رجال کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟اس موضوع پر ایک جامع نوٹ قلم بند کیجئے۔(20)

تعارف

حدیث کی سند جن راویوں سے بنتی ہے، ان راویوں کی زندگیوں، علمی مرتبے اور ثقاہت و کمزوری کو جاننے والے علم کو علمِ رجال کہا جاتا ہے، اور جن ائمہ و محدثین نے اس میدان میں عمر بھر محنت کر کے راویوں کی تاریخ محفوظ کی، وہ علماءِ رجال کہلاتے ہیں۔ یہ حضرات اُمت کے وہ محسن ہیں جن کی بیدار مغزی کی وجہ سے آج ہم تک یہ فیصلہ محفوظ پہنچا ہے کہ فلاں راوی ثقہ ہے، فلاں ضعیف ہے، فلاں کی وفات کس سال ہوئی اور فلاں نے کن اساتذہ سے سنا ہے۔ اگر علمِ رجال نہ ہوتے تو صحیح و ضعیف روایت میں تمیز کا کوئی نظام باقی نہ رہتا اور حدیث کی حفاظت کا دعویٰ محض زبانی رہ جاتا۔ اس نوٹ میں پہلے علمِ رجال کی تعریف و اقسام بیان ہوں گی، پھر اس علم کے بانیان و ارتقا کا جائزہ لیا جائے گا، اس کے بعد بڑے بڑے علماءِ رجال اور ان کی مشہور کتابوں کا تعارف پیش کیا جائے گا، اور آخر میں اس فن کی اہمیت اور اس میں احتیاط کے اصول بیان ہوں گے۔

علمِ رجال کا مفہوم اور اس کی شاخیں

رجال کا لفظ رجل کی جمع ہے جس کے معنی مردوں کے ہیں، مگر علمِ حدیث میں اس سے مراد سند میں آنے والے تمام راوی ہیں، خواہ مرد ہوں یا خواتین، کیونکہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابیات و محدثات بھی بڑی راویات میں شامل ہیں اور کتبِ رجال میں ان کے تراجم اسی شان سے ملتے ہیں۔ علمِ رجال دراصل کئی ذیلی علوم کا مجموعہ ہے۔ علمِ تراجم و طبقات میں راوی کی زندگی اور اس کا طبقہ بیان ہوتا ہے۔ علمِ جرح و تعدیل میں راوی کی عدالت و ضبط پر کلام ہوتا ہے؛ جرح سے مراد راوی کی وہ کمزوری بیان کرنا ہے جس کی وجہ سے اس کی روایت قبول نہیں ہوتی اور تعدیل سے مراد اس کی ثقاہت و ستائش کی تصدیق ہے۔ علمِ تواریخ میں راویوں کی ولادت و وفات اور اسفار کی تاریخیں ضبط ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ثقات پر الگ کتابیں لکھی گئیں، ضعفاء و متروکین پر الگ، مدلسین اور مختلطین پر الگ، کنیٰ و انساب اور مؤتلف و مختلف ناموں کی توضیح پر

الگ کتب مرتب ہوئیں۔ یہ پوری شاخیں مل کر ایک ایسا جامع نظام بناتی ہیں جس میں کسی بھی سند کے ہر فرد کو تلاش کرنا اور اس کا پورا علمی ریکارڈ سامنے لانا ممکن ہو گیا ہے۔ علماءِ رجال سے مراد وہی ائمہ ہیں جنہوں نے ان شاخوں میں سے کسی نہ کسی میں نمایاں خدمت انجام دی اور جن کے اقوال کتبِ رجال میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

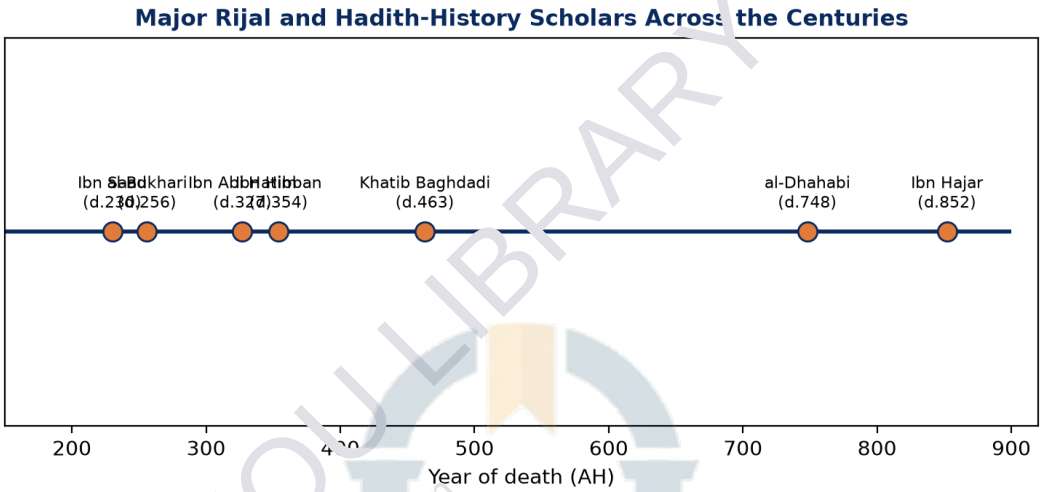

خاکہ 1: مختلف صدیوں کے مشہور علماءِ رجال و تاریخِ حدیث (سن وفات ہجری کے اعتبار سے)

اس علم کا آغاز و ارتقا

علمِ رجال کا آغاز راوی کے بارے میں سوال کرنے کی سادہ صورت سے ہوا، جو صحابہ کے دور ہی میں فتنوں کے ظہور کے بعد نمایاں ہوئی۔ مشہور قول ہے کہ جب فتنہ پیدا ہوا تو اہلِ علم نے کہا کہ اپنے راویوں کے نام بتاؤ، پھر اہلِ سنت کی روایت لی گئی اور اہلِ بدعت کی روایت چھوڑ دی گئی؛ یہی جملہ سند اور رجال کی اہمیت کی قدیم ترین بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں راویوں پر کلام زبانی مجالس میں ہوتا رہا، شعبہ بن حجاج (متوفی 160ھ) کو عموماً اس فن میں باقاعدہ کلام کرنے والے اولین ائمہ میں شمار کیا جاتا ہے، اس لیے انہیں امیر المؤمنین فی الحدیث کہا گیا۔ تیسری صدی ہجری اس فن کی باقاعدہ تدوین کا دور ہے، جب یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل اور امام بخاری و مسلم جیسے ائمہ نے جرح و تعدیل کو فن کی صورت دی اور ان کے اقوال بڑی کتابوں میں جمع ہونے لگے۔ چوتھی صدی میں ابنِ ابی حاتم، ابنِ حبان اور ابنِ عدی نے بڑے بڑے مجموعے مرتب کیے۔ اس کے بعد کے ادوار میں خطیب بغدادی، ابنِ عساکر، مزّی، ذہبی اور ابنِ حجر نے اس فن کو موسوعات کی شکل دی، یہاں تک کہ کسی بھی راوی کے بارے

میں آج معلومات تلاش کرنا گزشتہ ادوار کے مقابلے میں بہت آسان ہو گیا ہے۔ یہ ارتقا اس بات کا ثبوت ہے کہ علمِ رجال کسی ایک نسل کا کام نہیں بلکہ چودہ صدیوں کی مسلسل اجتماعی محنت ہے۔

نمایاں علماءِ رجال اور ان کی کتابیں

علماءِ رجال کی فہرست بہت طویل ہے، مگر چند نام اور ان کی کتابیں ہر طالب علم کو یاد ہونی چاہئیں۔ امام یحییٰ بن معین (متوفی 233ھ) جرح و تعدیل کے سخت گیر اور سب سے زیادہ اقوال رکھنے والے امام ہیں؛ ان کے اقوال تاریخ و علل کی مختلف روایات سے جمع کیے گئے۔ علی بن مدینی (متوفی 234ھ) عللِ حدیث اور رجال کی معرفت میں اپنے دور کے امام تھے اور امام بخاری خود ان کے شاگرد تھے۔ امام بخاری (متوفی 256ھ) نے التاریخ الکبیر، الاوسط اور الصغیر لکھ کر راویوں کی تاریخ کو آٹھ جلدوں میں محفوظ کر دیا، اس کے علاوہ کتاب الضعفاء بھی ان سے منسوب ہے۔ امام ابو حاتم رازی (متوفی 277ھ) اور ان کے صاحبزادے ابن ابی حاتم (متوفی 327ھ) کی الجرح والتعدیل اس فن کی بنیادی کتابوں میں ہے جس میں ائمہ کے اقوال مرتب انداز میں جمع ہیں۔ امام نسائی (متوفی 303ھ) کی کتاب الضعفاء والمتروکین اور امام عقیلی و ابنِ حبان (متوفی 354ھ) کی کتاب الثقات اور کتاب المجروحین اہم مآخذ ہیں۔ ابنِ عدی (متوفی 365ھ) نے الکامل فی ضعفاء الرجال میں ضعیف راویوں کی روایات سمیت حالات جمع کیے۔ خطیب بغدادی (متوفی 463ھ) کی تاریخ بغداد چودہ جلدوں میں ہزاروں راویوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ حافظ مزّی (متوفی 742ھ) نے تہذیب الکمال میں کتبِ ستہ کے راویوں کا عظیم الشان مجموعہ تیار کیا، حافظ ذہبی (متوفی 748ھ) نے میزان الاعتدال، الکاشف اور سیر اعلام النبلاء جیسی کتابیں دیں، اور حافظ ابنِ حجر (متوفی 852ھ) نے تہذیب التہذیب، لسان المیزان، الاصابہ فی تمییز الصحابہ اور تقریب التہذیب میں گزشتہ تمام محنتوں کا خلاصہ پیش کر دیا۔ ان حضرات میں سے ہر ایک کی زندگی اسی ایک مقصد میں گزری کہ حدیث کے نقل کرنے والوں کی درست پہچان امت کے پاس محفوظ رہے۔

جدول 1: چند مشہور علماءِ رجال اور ان کی نمایاں کتب

عالم (وفات)	نمایاں کتاب / خدمت

جرح وتعدیل میں سب سے زیادہ محفوظ اقوال	یحییٰ بن معین (233ھ)
التاریخ الکبیر، الاوسط، الصغیر؛ کتاب الضعفاء	امام بخاری (256ھ)
الجرح والتعدیل — ائمہ کے اقوال کا مرتب مجموعہ	ابنِ ابی حاتم (327ھ)
کتاب الثقات اور کتاب المجروحین	ابنِ حبان (354ھ)
الکامل فی ضعفاء الرجال	ابنِ عدی (365ھ)
میزان الاعتدال، الکاشف، سیر اعلام النبلاء	حافظ ذہبی (748ھ)
تہذیب التہذیب، لسان المیزان، الاصابہ، تقریب التہذیب	حافظ ابنِ حجر (852ھ)

جرح وتعدیل میں احتیاط اور اس فن کی اہمیت

علماءِ رجال کے ہاں راوی پر کلام کھیل نہیں تھا بلکہ سخت اصولوں کے تابع تھا۔ جرح کرنے والے کے لیے شرط تھی کہ وہ خود عادل وضابط ہو، راوی کو ذاتی دشمنی یا مسلکی تعصب کی بنیاد پر نہ پرکھے اور جرح کی وجہ بیان کر سکے؛ اسی لیے اہلِ علم نے مفسّر جرح کو غیر مفسّر جرح پر ترجیح دی اور معاصرین کی باہمی سختی کو احتیاط سے لیا، کیونکہ ہم عصروں میں علمی منافست سے بھی کلام ہو جاتا تھا۔ اسی احتیاط کا نتیجہ ہے کہ اس فن میں کسی راوی کی غیبت جائز سمجھ کر نہیں بلکہ دین کی حفاظت کی نیت سے بیان ہوتی ہے، اور اہلِ علم نے اسے نصیحت للمسلمین کے باب میں رکھا ہے۔ اس فن کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فقہی حکم کا مدار حدیث کے درجے پر ہے اور حدیث کا درجہ راویوں کے حالات پر موقوف ہے؛ اگر راوی نامعلوم یا ضعیف نکل آئے تو روایت کا حکم بدل جاتا ہے۔ تاریخِ حدیث کے طالب علم کے لیے بھی یہی فن وہ پُل ہے جو اسے صحیفوں کے دور سے کتبِ ستہ کے دور تک لے جاتا ہے، کیونکہ ہر دور کے مصنف کی سوانح اور اس کی کتاب کا مرتبہ اسی علم سے متعین ہوتا ہے۔ آج کے دور میں اس فن کی اہمیت کم نہیں ہوئی؛ جب بھی

کسی روایت کی تحقیق مطلوب ہوتی ہے تو پہلا قدم راویوں کو کتبِ رجال میں تلاش کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ راویوں پر تاریخی کلام بیان کرنا ایک علمی عمل ہے؛ اس سے کسی موجودہ شخص یا جماعت پر حکم لگانا اس نوٹ کا موضوع نہیں اور ایسے اطلاقات اہلِ علم کے دائرے میں رہنے چاہئیں۔

اختتام

خلاصہ یہ ہے کہ علماءِ رجال وہ ائمۂ حدیث ہیں جنہوں نے سند کے ہر راوی کی زندگی، طبقہ، ثقاہت و کمزوری اور تاریخ کو محفوظ کر کے حدیث کی حفاظت کو ایک باقاعدہ سائنسی نظام بنا دیا۔ شعبہ بن حجاج سے لے کر ابنِ معین، امام بخاری، ابنِ ابی حاتم، ذہبی اور ابنِ حجر تک یہ سلسلہ چودہ صدیوں تک چلتا رہا اور تاریخ الکبیر سے تہذیب التہذیب تک سینکڑوں جلدیں اس فن کی یادگار ہیں۔ علمِ رجال نہ ہو تو نہ طبقات سمجھ میں آئیں، نہ جرح و تعدیل کی بنیاد رہے اور نہ صحیح و ضعیف کی تمیز ممکن ہو؛ یہی وجہ ہے کہ اسے علومِ حدیث کا سب سے مشکل اور سب سے ضروری علم کہا گیا ہے۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

سوال: امام بیہقی اور خطیب بغدادی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ ان ائمہ کی تالیفی خدمات کی نشاندہی کیجئے۔ (20)

تعارف

پانچویں صدی ہجری محدثین کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جس میں حدیث کی تدوین کے بڑے مرحلے مکمل ہو چکے تھے اور اب ائمہ کا کام ذخیرۂ حدیث کو سنن و آثار کی ترتیب سے پھیلانا، فقہی دلائل کی صورت میں مرتب کرنا اور خود علمِ روایت کے اصول و تاریخ کو محفوظ کرنا تھا۔ اس دور کی دو عظیم شخصیات امام ابو بکر بیہقی (متوفی 458ھ) اور حافظ خطیب بغدادی (متوفی 463ھ) ہیں۔ بیہقی نے سنن و اعتقاد و دلائل النبوہ کے میدان میں موسوعات چھوڑے اور خطیب نے تاریخ بغداد اور اصولِ روایت کی کتابوں سے علمِ حدیث کو ایسی بنیاد دی جس کے بغیر آج اصولِ حدیث کا نصاب مکمل نہیں ہوتا۔ دونوں ہم عصر تھے، دونوں نے طلبِ علم میں طویل اسفار کیے اور دونوں کی

وفات بھی قریب قریب زمانے میں ہوئی۔ اس جواب میں پہلے امام بیہقی کی زندگی و تصانیف، پھر خطیب بغدادی کی زندگی و تصانیف کا تعارف پیش کیا جائے گا اور آخر میں دونوں کے تقابلی علمی مقام کا خلاصہ دیا جائے گا۔

امام بیہقی: حالاتِ زندگی

آپ کا نام احمد بن حسین بن علی بیہقی ہے اور کنیت ابو بکر ہے۔ آپ 384ھ میں خراسان کے علاقے بیہق کے ایک گاؤں خسروجرد میں پیدا ہوئے؛ بیہق نیشاپور کے نواح کا مشہور علاقہ تھا، اسی نسبت سے آپ بیہقی کہلائے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی، پھر نیشاپور آ کر اس دور کے بڑے ائمہ سے علم لیا۔ آپ کے سب سے نمایاں استاد حاکم نیشاپوری ابو عبداللہ صاحبِ مستدرک ہیں، جن سے آپ نے بطور خاص فیض حاصل کیا اور ان کے علمی سلسلے کو آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ آپ نے خراسان، عراق، حجاز اور دیگر علمی مراکز کا سفر کر کے ہزاروں شیوخ سے سماع کیا، کیونکہ اہلِ سیر لکھتے ہیں کہ آپ کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ فقہ میں آپ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کے بڑے ناصر اور مدافع تھے، بلکہ اہلِ علم نے یہاں تک کہا ہے کہ شافعی فقہ و حدیث کے جمع کرنے میں بیہقی کی خدمات اپنے دور میں نمایاں ترین ہیں، اور ان کی کتب خصوصاً معرفۃ السنن والآثار امام شافعی کے اقوال و دلائل کا بڑا ماخذ ہے۔ مزاجاً آپ زاہد، قناعت پسند اور عبادت گزار تھے؛ تصنیف و تدریس ہی آپ کی زندگی کا مشغلہ رہا۔ آپ کا انتقال 458ھ میں نیشاپور میں ہوا اور آپ کو بیہق میں دفن کیا گیا۔ آپ کی عمر لگ بھگ چوہتر سال ہوئی، جس کا بڑا حصہ لکھنے پڑھنے میں گزرا، اسی لیے اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ آپ کی تصانیف کے اجزا ہزار تک پہنچتے ہیں۔

امام بیہقی کی تالیفی خدمات

امام بیہقی کی تصانیف کئی میدانوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ سب سے مشہور کتاب السنن الکبریٰ ہے، جسے السنن الکبیر بھی کہا جاتا ہے؛ یہ دس بڑی جلدوں میں فقہی ابواب کی ترتیب پر احادیث و آثار کا عظیم مجموعہ ہے، جس میں مؤلف نے ہر باب میں صحیح و ضعیف روایات کو جمع کر کے اہلِ فن کے لیے دلائل کا پورا ذخیرہ تیار کر دیا ہے اور اس کتاب کو فقہی احادیث کے موسوعات میں بڑا مقام حاصل ہے۔ اسی کی مختصر صورت میں السنن الصغریٰ بھی ہے۔ معرفۃ السنن والآثار میں آپ نے امام شافعی کے فقہی دلائل کو آثار و روایات

کے ساتھ مرتب کیا۔ اعتقاد کے میدان میں آپ کی کتاب الاعتقاد والہدایہ اور الاسماء والصفات بڑی اہمیت رکھتی ہیں، جن میں آپ نے اہلِ سنت کے عقائد کو روایات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ دلائل النبوہ سات جلدوں میں سیرت و نبوت کے دلائل کا مشہور مجموعہ ہے جو آج بھی اس موضوع کے بنیادی مآخذ میں ہے۔ شعب الایمان ایمان کی شاخوں پر مرتب کردہ بڑی کتاب ہے جسے بعد میں مختصر بھی کیا گیا اور وہ دروس و مطالعے میں عام استعمال ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ کتاب القضاء والقدر، کتاب البعث والنشور، الدعوات الکبیر، کتاب الزہد اور مناقبِ شافعی پر کتابیں بھی آپ سے منسوب مشہور تصانیف میں شامل ہیں۔ بیہقی کی تصانیف کی مجموعی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کو فقہ، عقیدہ اور سیرت تینوں میدانوں میں یکساں محنت سے مرتب کیا اور ہر موضوع پر الگ مجموعہ چھوڑا، جس کی مثال ان کے ہم عصروں میں کم ملتی ہے۔

خطیب بغدادی: حالاتِ زندگی

آپ کا نام احمد بن علی بن ثابت ہے، کنیت ابو بکر اور شہرت خطیب بغدادی ہے۔ آپ 392ھ میں بغداد کے نواح میں پیدا ہوئے اور بغداد ہی میں نشوونما پائی؛ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا اور کم عمری میں حدیث کی سماعت شروع کر دی۔ طلبِ علم میں آپ نے عراق کے علاوہ شام، حجاز، خراسان اور دیگر مراکز کے طویل اسفار کیے اور اپنے دور کے جلیل القدر محدثین سے روایت حاصل کی۔ آپ کو فنِ تاریخ اور اسماء الرجال میں خاص مہارت حاصل تھی اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی شہرت کی سب سے بڑی بنیاد تاریخ بغداد بنی۔ آپ کی زندگی میں ایک معروف آزمائش بھی آئی جب بعض معاصرین کی ناراضی و حسد کی بنا پر آپ کو بغداد چھوڑ کر دمشق و دیگر شہروں میں کچھ عرصہ گزارنا پڑا، مگر آپ کا علمی سلسلہ رکا نہیں اور بعد میں آپ بغداد واپس آ کر اسی شہر میں انتقال کر گئے۔ فقہ میں آپ ابتدا میں حنبلی مسلک سے وابستہ رہے اور بعد میں شافعی فقہ کی طرف ان کا میلان مشہور ہے؛ اس بحث کو اہلِ علم نے ان کے تراجم میں تفصیل سے بیان کیا ہے، طالب علم کے لیے اصل نکتہ یہ ہے کہ آپ کا اصل میدان حدیث، تاریخ اور اصولِ روایت تھا، اور اسی میدان میں آپ امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ کا انتقال 463ھ میں بغداد میں ہوا اور آپ کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مقبرے کے قرب میں دفن کیا گیا۔ اہلِ علم نے ان کے بارے میں یہ تاثر محفوظ کیا ہے کہ ان کے بعد بغداد میں ان جیسا حافظِ حدیث و مؤرخ کم پیدا ہوا۔

خطیب بغدادی کی تالیفی خدمات

خطیب بغدادی کی سب سے بڑی کتاب تاریخ بغداد ہے، جسے تاریخ مدینۃ السلام بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چودہ جلدوں میں شہر بغداد کی تاریخ اور اس شہر سے تعلق رکھنے والے تقریباً آٹھ ہزار علماء و محدثین کے تراجم پر مشتمل ہے اور علمِ رجال کی سب سے بڑی مقامی تاریخوں میں شمار ہوتی ہے؛ کسی بھی بغدادی راوی کی تحقیق میں آج بھی پہلا حوالہ یہی کتاب بنتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی اصل شہرت اصولِ روایت کی کتابوں سے ہے۔ الکفایہ فی علم الروایہ اصولِ حدیث کی اولین جامع کتابوں میں سے ہے جس میں روایت، راوی اور روایت کی اقسام کے اصول بیان ہوئے ہیں۔ الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع میں محدث اور طالب علم کے آداب کو روایات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ شرف اصحاب الحدیث اور نصیحت اہل الحدیث میں اہلِ حدیث کے مقام و آداب کی بحث ہے۔ اقتضاء العلم العمل میں علم پر عمل کی ترغیب کی روایات جمع ہیں۔ الرحلہ فی طلب الحدیث میں طلبِ علم کے اسفار کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ المؤتلف والمختلف اور تلخیص المتشابہ میں ہم شکل ناموں کی توضیح، المتفق والمفترق میں ہم نام راویوں کی تمیز، الفقیہ والمتفقہ میں فقہ و تفقیہ کے آداب و اصول، اور سابق و لاحق جیسی نوعیت کی درجنوں کتابیں آپ سے منسوب ہیں؛ اہلِ سیر نے آپ کی تصانیف کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ شمار کی ہے۔ ان کتابوں کا مجموعی وصف یہ ہے کہ خطیب نے علمِ حدیث کے تقریباً ہر ذیلی فن پر الگ تصنیف چھوڑی، اور یہی وجہ ہے کہ متاخرین اصولِ حدیث کی تدوین میں ان کو بنیادی ماخذ بناتے ہیں۔

جدول 1: امام بیہقی اور خطیب بغدادی — تقابلی تعارف

پہلو	امام بیہقی (384ھ – 458ھ)	خطیب بغدادی (392ھ – 463ھ)
مرکز	بیہق و نیشاپور (خراسان)	بغداد (عراق)
نمایاں میدان	سنن، فقہی احادیث، عقیدہ و دلائل النبوہ	تاریخ، رجال اور اصولِ روایت
سب سے مشہور کتاب	السنن الکبریٰ (دس جلدیں)	تاریخ بغداد (چودہ جلدیں)

الکفایہ فی علم الروایہ، الجامع لاخلاق الراوی، شرف اصحاب الحدیث، الفقیہ والمتفقہ	معرفۃ السنن والآثار، دلائل النبوہ، شعب الایمان، الاسماء والصفات	دیگر نمایاں کتب

دونوں ائمہ کا علمی مقام اور اختتام

بیہقی اور خطیب کے کارناموں کو ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو پانچویں صدی کی حدیثی خدمت کی مکمل تصویر بنتی ہے: ایک طرف بیہقی نے متن و دلائل کو فقہی ابواب میں پھیلایا اور عقیدہ و سیرت کے موسوعات مرتب کیے، دوسری طرف خطیب نے سند کے علم، راویوں کی تاریخ اور روایت کے آداب و اصول کو محفوظ کر دیا۔ گویا ایک نے حدیث کے ذخیرے کو وسعت دی اور دوسرے نے اس ذخیرے کو پرکھنے اور استعمال کرنے کے قواعد دے دیے۔ دونوں سے بعد کے ہر محدث و مؤرخ نے استفادہ کیا؛ بیہقی کی سنن آج بھی فقہی استدلال میں اور خطیب کی کفایہ و تاریخ آج بھی اصول و رجال کی تحقیق میں بنیادی حوالے ہیں۔ طالب علم کے لیے ان دونوں کی سیرت کا سب سے بڑا سبق محنت، اسفارِ طلب اور ساری زندگی ایک فن کے لیے وقف کر دینا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام بیہقی اور خطیب بغدادی پانچویں صدی ہجری کے دو بڑے محدث و مؤرخ تھے؛ بیہقی کی السنن الکبریٰ، دلائل النبوہ اور شعب الایمان جیسی کتابیں اور خطیب کی تاریخ بغداد، الکفایہ اور الجامع جیسی کتابیں ان کی تالیفی خدمات کی روشن نشانیاں ہیں جن سے علمِ حدیث کا خزانہ ہمیشہ کے لیے مالا مال ہو گیا۔